ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1951

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :تعارفِ قرآن • (1951) سطح :بی ایس علومِ اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 تا(5

کل نمبر 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com

سوال نمبر :1 جمعِ قرآن کے معنی، عہدِ رسالت کے مکتوبہ صحیفے اور عہدِ صدیقی میں جمع کے اسباب 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ جمع قرآن کے کیا معنی ہیں؟ عہد رسالت میں قرآن مجید کے مکتوب صحیفوں اور عہد صدیقی میں قرآن کو جمع کرنے کے اسباب تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

قرآنِ مجید کی حفاظت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی اور کتاب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" :إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ "یعنی بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں) الحجر(9 :۔ اسی وعدے کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ قرآن ایک طرف لاکھوں سینوں میں

محفوظ ہوا اور دوسری طرف پہلی وحی سے لے کر آخری وحی تک مسلسل لکھا جاتا رہا۔ علومِ قرآن کی اصطلاح میں اسی حفاظت و اہتمام کے ایک اہم مرحلے کو" جمعِ قرآن "کہا جاتا ہے۔ اس سوال میں پہلے جمع کے معنی واضح کیے جائیں گے، پھر عہدِ رسالت میں قرآن کے مکتوب صحیفوں کی صورت بیان ہوگی اور آخر میں عہدِ صدیقی میں قرآن کو ایک مصحف میں جمع کرنے کے اسباب تفصیل سے لکھے جائیں گے۔

جمعِ قرآن کے لغوی اور اصطلاحی معنی

لفظ" جمع "عربی زبان میں اکٹھا کرنے، یکجا کرنے اور منتشر چیزوں کو ایک جگہ سمیٹنے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآنِ مجید کے سلسلے میں علماء نے جمع کے تین مفہوم بیان کیے ہیں۔ پہلا مفہوم حفظ کرنا ہے، کیونکہ عرب کے ہاں جو شخص قرآن کو سینے میں محفوظ کر لیتا اسے بھی" جامع القرآن "کہتا تھا، یعنی اس نے قرآن کو اپنے حافظے میں جمع کر لیا۔ اسی بنا پر حفاظِ قرآن کو" جمع القرآن فی صدرہ "سے تعبیر کیا گیا۔ دوسرا مفہوم کتابت ہے، یعنی بکھرے ہوئے مکتوب صحیفوں اور مختلف اشیاء پر لکھی ہوئی آیات و سورتوں کو تلاش کر کے ایک جگہ نقل و جمع کر دینا۔ تیسرا مفہوم ترتیب و تدوین ہے، یعنی آیات و سورتوں کو اس توقیفی ترتیب کے مطابق ایک مصحف کی صورت میں مرتب کر دینا جو نبی کریم ﷺ نے اللہ کے حکم سے مقرر فرمائی تھی۔

تاریخی اعتبار سے جمعِ قرآن کے تین بڑے مراحل سامنے آتے ہیں۔ پہلا مرحلہ عہدِ رسالت کا ہے، جب وحی نازل ہوتے ہی لکھ لی جاتی، حفاظ اسے یاد کرتے اور نبی کریم ﷺ خود اس کی ترتیب کی نگرانی فرماتے، لیکن یہ لکھا ہوا مواد مختلف صحیفوں اور مختلف اشیاء پر متفرق صورت میں موجود تھا اور ایک جلد میں بندھا ہوا مصحف ابھی تیار نہیں ہوا تھا۔ دوسرا مرحلہ عہدِ صدیقی کا ہے، جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں تمام مکتوب و محفوظ قرآن کو سخت شرائط کے ساتھ ایک مصحف میں جمع کیا گیا۔ تیسرا مرحلہ عہدِ عثمانی کا ہے، جب ان صحیفوں کی بنیاد پر ایک معیاری مصحف تیار کر کے اس کی نقول مختلف شہروں میں بھیجی گئیں۔ اس سوال کا اصل تعلق پہلے دو مراحل سے ہے۔

عہدِ رسالت میں کتابتِ وحی اور مکتوبہ صحیفے

عہدِ رسالت میں قرآن کی حفاظت کا بنیادی ذریعہ حفظ تھا، کیونکہ عرب قوم اپنی غیر معمولی قوتِ حافظہ کے لیے مشہور تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتابت کا اہتمام بھی پہلی وحی سے شروع ہو گیا تھا۔ جب کوئی آیت یا سورت نازل ہوتی تو نبی کریم ﷺ کاتبینِ وحی کو بلاتے، آیت املا کراتے اور ساتھ یہ بھی بتا دیتے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھی جائے۔ اس طرح آیات کی ترتیب خود نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے مقرر ہوتی تھی، اسی لیے اسے ترتیبِ توقیفی کہا جاتا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن کو صحیفوں میں لکھا کرتے تھے اور آپ ﷺ ہمیں اس کی ترتیب بتایا کرتے تھے۔

کاتبینِ وحی کی ایک باقاعدہ جماعت مقرر تھی جس میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاویہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہم سمیت کئی جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کام میں خاص مقام حاصل تھا، کیونکہ وہ خود حافظِ قرآن بھی تھے اور آخری دور میں پیش کی گئی تلاوت، جسے عرضۂ اخیرہ کہا جاتا ہے، میں شریک بھی تھے۔ اسی وجہ سے بعد میں جمعِ قرآن کی ذمہ داری بھی انہی کے سپرد ہوئی۔

اس دور میں کاغذ عام دستیاب نہیں تھا، اس لیے وحی جن چیزوں پر لکھی جاتی تھی انہیں مکتوبہ صحیفوں اور کتابت کے وسائل کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔ ان میں رق یعنی چمڑے کے باریک ٹکڑے، عُسُب یعنی کھجور کی چوڑی شاخیں جن کے پتے جھاڑ دیے گئے ہوں، لِخاف یعنی سفید باریک پتھر کی سلیں، اَکتاف یعنی اونٹ اور بکری کی چوڑی ہڈیاں، اَقتاب یعنی لکڑی کے تختے، اور قراطیس یعنی کاغذ وغیرہ شامل تھیں۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عہدِ صدیقی میں جمعِ قرآن کا ذکر کرتے ہوئے انہی اشیاء کا نام لیا ہے کہ انہوں نے قرآن کو کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کر کے جمع کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں پورا قرآن لکھا ہوا موجود تھا، مگر مختلف صحیفوں میں متفرق تھا اور ایک جلد میں مجلد نہیں تھا۔

کتابت کے ساتھ ساتھ اس مکتوب مواد کی جانچ کا نظام بھی قائم تھا۔ ہر سال رمضان میں نبی کریم ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سامنے اس سال تک نازل شدہ قرآن کی تلاوت فرماتے، جسے عرضہ کہا جاتا ہے، اور وفات کے سال یہ عرضہ

دو مرتبہ ہوا، اسے عرضۂ اخیرہ کہتے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں بتایا کہ جبرائیل ہر سال ایک بار میرے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے اور اس سال دو بار کیا ہے، جس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس عرضے میں مکتوب صحیفوں کی تصحیح بھی ہو جاتی اور منسوخ التلاوت حصے الگ ہو جاتے۔ نمازوں، خطبوں اور مجالس میں مسلسل تلاوت بھی اس مکتوب و محفوظ قرآن کی عوامی توثیق کا ذریعہ تھی۔

عہدِ صدیقی میں قرآن کو جمع کرنے کے اسباب

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا پہلا بڑا مسئلہ یہ پیش آیا کہ مرتدین اور مدعیانِ نبوت کے خلاف جنگیں شروع ہو گئیں۔ انہی جنگوں میں 12 ہجری میں یمامہ کے مقام پر مسیلمہ کذاب کے لشکر سے سخت معرکہ ہوا۔ اس جنگ میں کثیر تعداد میں صحابہ شہید ہوئے جن میں تقریباً ستر ایسے قاری اور حافظِ قرآن بھی شامل تھے جن کے سینوں میں قرآن محفوظ تھا۔ یہ واقعہ جمعِ قرآن کا سب سے پہلا اور بنیادی سبب بنا کیونکہ اب یہ خطرہ حقیقی صورت میں سامنے آ گیا تھا کہ اگر حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کا ایک حصہ ضائع ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی خطرے کو سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور مشورہ دیا کہ قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا جائے، کیونکہ یمامہ میں قراء کی شہادت بہت زیادہ ہوئی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی قراء شہید ہوں گے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں تردد فرمایا کہ میں وہ کام کیسے کروں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ اس کام کے لیے کھول دیا اور انہیں بھی وہی رائے درست معلوم ہونے لگی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ یہ واقعہ اس بات کی خوب صورت مثال ہے کہ حفاظتِ قرآن کا یہ فیصلہ ذاتی خواہش نہیں بلکہ اجتماعی غور و فکر اور شرحِ صدر کے بعد کیا گیا۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ حضرت زید نے بھی ابتدا میں اسی تردد کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر مجھے ایک پہاڑ کو جگہ سے ہٹانے کا حکم دیا جاتا تو وہ مجھ پر اس ذمہ داری سے زیادہ بھاری نہ ہوتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی اہلیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نوجوان، عقل مند ہو،

تم پر کوئی الزام نہیں، اور تم رسول اللہ ﷺ کے لیے وحی لکھا کرتے تھے، پس قرآن کو تلاش کر کے جمع کرو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلسل سمجھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا سینہ بھی کھول دیا اور انہوں نے یہ عظیم امانت قبول کر لی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع کا کام انتہائی سخت شرائط کے ساتھ انجام دیا۔ انہوں نے صرف اپنے حافظے پر اکتفا نہیں کیا، حالانکہ وہ خود حافظ تھے، بلکہ ہر آیت کے لیے مکتوب ثبوت طلب کیا۔ قاعدہ یہ مقرر ہوا کہ جو صحابی کوئی مکتوب صحیفہ پیش کرے اس کے ساتھ دو عادل گواہ بھی یہ گواہی دیں کہ یہ صحیفہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا۔ اس طرح حفظ اور کتابت دونوں ذرائع کو باہم ملا کر مکمل توثیق کی گئی۔ تمام مواد کی جانچ کے بعد قرآن ایک مصحف کی صورت میں جمع ہوا۔ سورۂ توبہ کی آخری آیات کے بارے میں روایت ہے کہ وہ حضرت ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں۔ یہ صحیفے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منتقل ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہے، اور بعد میں عہدِ عثمانی میں معیاری مصحف کی تیاری میں یہی صحیفے بنیاد بنے۔

جدول: جمعِ قرآن کے مراحل کا خلاصہ

مرحلہ	دور	صورت و خصوصیت
پہلا مرحلہ	عہدِ رسالت	وحی کی فوری کتابت کاتبینِ وحی کے ذریعے، حفظِ صدر اور ترتیبِ توقیفی، مواد متفرق صحیفوں میں
دوسرا مرحلہ	عہدِ صدیقی	جنگِ یمامہ کے بعد تمام مکتوب و محفوظ قرآن کی سخت شرائط کے ساتھ ایک مصحف میں تدوین
تیسرا مرحلہ	عہدِ عثمانی	صحیفۂ صدیقی کی بنیاد پر معیاری مصحف کی تیاری اور نقول کی مختلف شہروں میں روانگی

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جمعِ قرآن سے مراد قرآن کو حفظ، کتابت اور ترتیب کے ساتھ یکجا و محفوظ کرنا ہے۔ عہدِ رسالت میں قیامِ کتابت، کاتبینِ وحی کی جماعت، مختلف اشیاء پر لکھے گئے مکتوبہ صحیفے اور سالانہ عرضے کے ذریعے قرآن مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا تھا، اگرچہ وہ ایک مجلد مصحف میں نہیں تھا۔ عہدِ صدیقی میں جنگِ یمامہ میں حفاظ کی بڑی تعداد میں شہادت، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بصیرت افروز مشورہ اور مستقبل کے خطرات کا پیشِ نظر ہونا وہ اسباب بنے جن کی وجہ سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دو گواہوں اور مکتوب ثبوت کی سخت شرائط کے ساتھ قرآن کو ایک مصحف میں جمع کر دیا۔ یہی اہتمام اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن آج تک بالکل اسی صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں نازل ہوا تھا۔

سوال نمبر :2 علم المخاصمہ اور قرآن کا چار گمراہ فرقوں سے مخاصمہ (20) نمبر

سوال نمبر2 ۔ علم المخاصمہ سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید نے کن چار گمراہ فرقوں سے مخاصمہ کیا ہے وضاحت کیجئے۔(20)

تعارف

قرآنِ مجید صرف احکام و عبادات کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ باطل عقائد اور گمراہ نظریات کا مدلل رد بھی ہے۔ جب قرآن نازل ہوا تو اس کے مخاطب صرف ماننے والے نہیں تھے؛ اس کے سامنے مشرکین کا شرک، یہود کی تحریف و ضد، نصاریٰ کا غلو اور منافقین کی دوغلی چال بھی تھی۔ قرآن نے ان سب سے کلام کیا، ان کے اعتراضات کا جواب دیا، ان کے شبہات کی جڑ کاٹی اور حق کو ایسے واضح دلائل سے ثابت کیا کہ معاند کے پاس فرار کی راہ نہ رہی۔ علومِ قرآن کی اصطلاح میں قرآن کے اسی مباحثہ و مجادلہ والے پہلو کو" علم المخاصمہ "کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب" الفوز الکبیر فی اصول التفسیر "میں قرآن کے علوم کو پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں ایک مستقل علم مخاصمہ کو قرار دیا ہے۔

علم المخاصمہ کا مفہوم

مخاصمہ کے لغوی معنی ہیں باہم جھگڑنا، بحث و تکرار کرنا اور دلائل کے ساتھ مدِ مقابل کا مقابلہ کرنا۔ اصطلاح میں علم المخاصمہ سے مراد وہ علم ہے جس میں قرآنِ مجید کی ان آیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو باطل فرقوں اور گمراہ گروہوں کے عقائد و نظریات کے رد، ان کے شبہات کے ازالے اور ان پر حجت تمام کرنے سے متعلق ہیں۔ اس علم میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن نے ہر گروہ کے مزاج، اس کی بیماری اور اس کے دلائل کی نوعیت کے مطابق کس اسلوب میں گفتگو کی، کہیں عقلی دلیل دی، کہیں تاریخی واقعہ بیان کیا، کہیں فطرت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور کہیں خود ان کی اپنی کتابوں سے ان پر حجت قائم کی۔

اس علم کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ قرآن نے مخاصمے کو محض جیتنے کی بحث نہیں بنایا بلکہ اسے دعوت و ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" :ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ " یعنی اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو) النحل(125 :۔ چنانچہ قرآنی مخاصمہ نہ گالم گلوچ ہے، نہ تعصب، بلکہ علم، انصاف اور خیر خواہی پر مبنی حجت ہے۔ یہی اسلوب آج کے مبلغ اور طالب علم کے لیے نمونہ ہے کہ مخالف سے گفتگو کرتے ہوئے دلیل کو جذبات پر غالب رکھا جائے۔

چار گمراہ فرقے جن سے قرآن نے مخاصمہ کیا

قرآنِ مجید نے بنیادی طور پر چار بڑے گمراہ گروہوں سے مخاصمہ کیا ہے :مشرکین، یہود، نصاریٰ اور منافقین۔ ان چاروں کے مزاج اور گمراہی کی نوعیت الگ الگ تھی، اس لیے قرآن کا اسلوبِ رد بھی ہر ایک کے بارے میں جداگانہ نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہر فرقے کی وضاحت الگ الگ پیش کی جاتی ہے۔

1۔ مشرکین سے مخاصمہ

مخاصمے کا پہلا اور سب سے بڑا میدان مشرکینِ عرب تھا، جن پر مکی سورتوں کا بیشتر حصہ نازل ہوا۔ ان کی بنیادی گمراہی شرک تھی :وہ اللہ کو خالق و رازق تو مانتے تھے لیکن عبادت میں بتوں کو شریک کرتے، انہیں سفارشی سمجھتے

اور کہتے کہ ہم انہیں اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں) الزمر(3 :۔ قرآن نے ان سے مخاصمہ کرتے ہوئے کائناتی و عقلی دلائل کی بھرمار کر دی :اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جاتا) الانبیاء(22 :؛ بت نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ نفع نقصان کے مالک ہیں؛ وہ خود مخلوق ہیں اور کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ خود پیدا کیے گئے ہیں) الاعراف(192-191 :۔ قرآن نے بار بار چیلنج کیا کہ تم اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے) الحج(73 :۔ دوبارہ زندہ ہونے کے انکار کا جواب یہ دیا گیا کہ جس نے پہلی بار پیدا کیا وہی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے) یٰس(79-78 :۔ اس کے علاوہ مشرکین کے رسوم و رواج، مثلاً بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے اور اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرنے کی بھی سخت مذمت کی گئی۔

2۔ یہود سے مخاصمہ

مدنی دور میں دوسرا بڑا مخاصمہ یہود سے ہوا، خصوصاً مدینہ کے یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے۔ یہ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود کئی گمراہیوں میں مبتلا تھے :وہ تورات میں تحریف کرتے، حق کو چھپاتے، اللہ کے بارے میں یہ جسارت کرتے کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے) المائدہ(64 :، حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے، انبیاء کی تکذیب و قتل میں ملوث رہے، اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہی اللہ کے چہیتے ہیں اور جنت صرف انہی کے لیے ہے) البقرہ : (111۔ قرآن نے ان پر انہی کی کتاب سے حجت قائم کی، ان کی تاریخ کے واقعات یاد دلائے، نبی آخر الزماں ﷺ کو وہ اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے پھر بھی حسد کی وجہ سے انکار کیا) البقرہ(146 :۔ قرآن نے واضح کیا کہ اللہ کے نزدیک عزت کا معیار نسل نہیں بلکہ ایمان و تقویٰ ہے، اور ان کے عہد شکنی، سود خوری اور باطل طریقے سے مال کھانے کی مذمت کی۔ ساتھ ہی ان میں سے انصاف پسند اہلِ ایمان کی تعریف بھی کی گئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی مخاصمہ اندھی مخالفت نہیں بلکہ اصول و انصاف پر مبنی ہے۔

3۔ نصاریٰ سے مخاصمہ

تیسرا فرقہ نصاریٰ تھا جن کی گمراہی کی بنیاد غلو اور عقیدۂ تثلیث تھی۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے نہایت نرم مگر فیصلہ کن اسلوب میں مخاصمہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا کہ یہ لوگ کفر کی بات کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے) المائدہ(72 :، اور صراحت کی کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ اس کی اولاد ہو) مریم(35 :۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت واضح کی کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے، روح اللہ اور کلمہ اللہ تھے، ان کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام جیسی ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا) آل عمران(59 :۔ حضرت مریم علیہا السلام کی پاک دامنی کی گواہی دی، معجزات کو اللہ کے اذن سے منسوب کیا اور وفدِ نجران کے مباہلے کے واقعے میں حق کو آخری حد تک واضح کر دیا۔ قرآن نے اہلِ کتاب کو مشترکہ کلمے کی طرف بھی بلایا کہ آؤ اس بات کی طرف جو ہم میں اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں) آل عمران(64 :۔ اس اسلوب میں نرمی کے ساتھ حجت کی قطعیت نمایاں ہے۔

4۔ منافقین سے مخاصمہ

چوتھا اور سب سے خطرناک فرقہ منافقین کا تھا، کیونکہ دشمن ظاہر ہو تو مقابلہ آسان ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ زبان سے ایمان کا اقرار کرتے اور دل میں کفر چھپاتے تھے۔ مدینہ میں عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں یہ گروہ مسلمانوں کی صفوں میں رہ کر سازشیں کرتا، جنگوں میں پیچھے ہٹتا، افواہیں پھیلاتا اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتا تھا۔ قرآن نے ان سے مخاصمہ کرتے ہوئے ان کی نفسیات کھول کر رکھ دی :ان کے دل مریض ہیں، وہ مفسد ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مصلح کہتے ہیں)البقرہ(12-11 :، وہ بزدل ہیں اور ہر آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں) المنافقون(4 :۔ سورۂ توبہ نے ان کے بہانوں، مسجدِ ضرار کی سازش اور غزوۂ تبوک سے فرار کی پوری تصویر کشی کی، اور سورۂ منافقون نے ان کے کردار کو مستقل عنوان بنا دیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اصل خطرہ اس اندرونی دشمن سے ہے، اس لیے ان کی باتوں میں آنے اور انہیں راز دار بنانے سے بچا جائے۔

قرآنی مخاصمے کے اسالیب و اصول

ان چاروں فرقوں سے مخاصمے کے مطالعے سے چند اصول واضح ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ قرآن ہر مخاطب کے شبہے کی تہہ تک جاتا ہے اور اسی کے مقام سے دلیل دیتا ہے؛ مشرک سے کائنات کی دلیل، یہودی سے اس کی تاریخ و کتاب کی دلیل، نصرانی سے عقلی و تاریخی دلیل اور منافق سے اس کے عمل و کردار کی شہادت۔ دوم یہ کہ قرآن نے ہمیشہ جدالِ احسن

کا طریقہ رکھا، سوائے ظالموں کے) العنکبوت(46 :۔ سوم یہ کہ مخاصمے کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا نہیں بلکہ حق کی وضاحت اور ہدایت کی راہ کھولنا ہے، اسی لیے رد کے ساتھ دعوت بھی جاری رہتی ہے۔

نتیجہ

نتیجتاً علم المخاصمہ علومِ قرآن کا وہ اہم باب ہے جو قرآن کے دفاعی و احتجاجی اسلوب کو بیان کرتا ہے۔ قرآنِ مجید نے چار بڑے گمراہ فرقوں یعنی مشرکین، یہود، نصاریٰ اور منافقین سے مخاصمہ کیا اور ہر ایک کی گمراہی کی نوعیت کے مطابق دلیل و حجت پیش کی :مشرکین کے شرک کو عقلی و کائناتی دلائل سے باطل کیا، یہود کی تحریف و عہد شکنی کو ان کی تاریخ سے ظاہر کیا، نصاریٰ کے غلو و تثلیث کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت واضح کر کے رد کیا اور منافقین کی دوغلی روش کو ان کے کردار کی نقاب کشائی سے بے نقاب کیا۔ یہ مخاصمہ آج بھی ہر دور کے باطل نظریات کے مقابلے میں طالب علمِ قرآن کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

سوال نمبر :3 علم التذکیر بایام اللہ — مختصر مگر جامع بیان 20) نمبر(

سوال نمبر3 ۔ علم التذکیر بایام اللہ کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیجئے۔(20)

تعارف

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے" الفوز الکبیر فی اصول التفسیر "میں قرآنِ مجید کے مضامین کو پانچ بڑے علوم میں تقسیم کیا ہے :علمِ احکام، علمِ مخاصمہ، علمِ تذکیر بآلاء اللہ، علمِ تذکیر بایام اللہ اور علمِ تذکیر بالموت و ما بعد الموت۔ ان میں چوتھا علم، یعنی علمِ تذکیر بایام اللہ، قرآن کے تاریخی و واقعاتی حصے سے متعلق ہے۔ قرآن کا ایک بڑا حصہ پچھلی قوموں کے واقعات، انبیاء کی سیرتوں، اللہ کی نصرت کے ایام اور نافرمان قوموں کی ہلاکت کے دنوں پر مشتمل ہے۔ یہ واقعات محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک باقاعدہ مقصد ہے، اور اسی مقصد و علم کو تذکیر بایام اللہ کہا جاتا ہے۔ اس سوال میں اس علم کا مفہوم، اس کی قرآنی بنیاد، اس کے نمونے اور اس کے مقاصد مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔

ایام اللہ کا مفہوم

"ایام اللہ "کا لفظی معنی ہے اللہ کے دن۔ عربی محاورے میں کسی قوم کے اہم واقعات والے دنوں کو اس قوم کے" ایام " کہا جاتا ہے، جیسے عرب اپنے مشہور معرکوں کو" ایام العرب "کہتے تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں ایام اللہ سے مراد وہ یادگار دن اور تاریخی واقعات ہیں جن میں اللہ تعالی کی قدرت، اس کی نصرت، اس کے انعامات یا اس کے عذاب کا خصوصی ظہور ہوا۔ ان میں وہ دن بھی شامل ہیں جن میں ایمان والوں کو دشمن پر غلبہ اور نجات ملی، جیسے بنی اسرائیل کی فرعون سے نجات کا دن، غزوۂ بدر کا دن جسے قرآن نے یوم الفرقان "کہا، اور وہ دن بھی شامل ہیں جن میں سرکش قومیں ہلاک ہوئیں، جیسے قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط اور فرعون کی غرقابی کے دن۔

اصطلاحی طور پر علمِ تذکیر بایام اللہ سے مراد وہ علم ہے جس میں قرآن مجید میں بیان کردہ تاریخی واقعات و ایام کو یاد دلانے، ان سے عبرت دلانے اور ان کے ذریعے موجودہ مخاطبین کو اللہ کی سنتوں کی طرف متوجہ کرنے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔" تذکیر "کا مطلب ہے یاد دہانی، کیونکہ انسان غفلت کا شکار ہو جاتا ہے اور ماضی کے واقعات کی یاد دہانی اس کی غفلت توڑ کر اسے عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اس علم کی اصل قرآنی بنیاد سورۂ ابراہیم کی یہ آیت ہے" :وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ "یعنی ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ اور انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ، بے شک اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں) ابراہیم(5 :۔

قرآن میں ایام اللہ کے نمونے

قرآنِ مجید میں ایام اللہ کی مثالیں پوری تفصیل کے ساتھ بھری ہوئی ہیں۔ سب سے نمایاں نمونہ بنی اسرائیل کی تاریخ ہے : فرعون کے ظلم سے نجات، دریا کا پھٹنا اور فرعون کا غرق ہونا، من و سلویٰ کا نزول، بچھڑے کی پرستش اور اس پر گرفت، اور تیہ کے میدان کی سرگردانی — یہ سب واقعات بار بار یاد دلائے گئے تاکہ مخاطبین کو اللہ کی نعمت اور اپنی نافرمانی دونوں یاد رہیں۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا طوفان، ہود علیہ السلام کی قوم عاد کی آندھی سے ہلاکت، صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کا اونٹنی کو مارنا اور چیخ سے ہلاک ہونا، لوط علیہ السلام کی قوم کی بستی کا

الٹ دیا جانا، اور شعیب علیہ السلام کی قوم مدین کا انجام — یہ تمام واقعات ایام اللہ کے عبرت ناک نمونے ہیں جنہیں قرآن مختلف سورتوں میں مناسب اختصار و تفصیل کے ساتھ دہراتا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے نصرت کے ایام بھی اسی علم کا حصہ ہیں۔ غزوۂ بدر کے دن کو اللہ نے یوم الفرقان کہا کیونکہ اس دن حق و باطل کا فیصلہ ہو گیا اور فرشتوں کی مدد سے تین سو تیرہ مسلمان ہزار کے لشکر پر غالب آئے۔ غزوۂ احزاب میں خندق اور آسمانی ہوا کے ذریعے متحدہ لشکروں کا ناکام لوٹنا، اور فتحِ مکہ کا دن جب اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو عزت کے ساتھ شہر میں داخل کیا، یہ سب مومنین کے لیے ایام اللہ ہیں۔ قرآن نے اہلِ ایمان کو ان دنوں کی یاد دلائی" :يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا) "الاحزاب(9 :۔ اس یاد دہانی کا مقصد ماضی پر فخر نہیں بلکہ حال میں شکر، صبر اور استقامت پیدا کرنا ہے۔

تذکیر بایام اللہ کے مقاصد

اس علم کے مقاصد نہایت گہرے ہیں۔ پہلا مقصد عبرت ہے، چنانچہ فرمایا گیا :لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ "یعنی ان کے قصوں میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے) یوسف(111 :۔ دوسرا مقصد دلوں کی تثبیت اور تسلی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ رسولوں کی خبروں میں سے ہم آپ کو وہ سب سناتے ہیں جس سے آپ کے دل کو مضبوط کریں) ہود(120 :۔ تیسرا مقصد اللہ کی سنت یعنی اس کے اٹل قانون کو سمجھانا ہے کہ جو قوم ایمان و عملِ صالح اختیار کرتی ہے وہ سرخرو ہوتی ہے اور جو تکبر و سرکشی کرتی ہے وہ بالآخر ہلاک ہوتی ہے، اور اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ چوتھا مقصد شکر و صبر کی تربیت ہے، جیسا کہ ابراہیم کی آیت میں صبار و شکور کا ذکر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پانچواں مقصد یہ ہے کہ تاریخ کے آئینے میں ہر قوم اپنے انجام کو دیکھ کر راہِ راست اختیار کرے اور اپنے آپ کو سابقہ قوموں کی غلطیوں سے بچائے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن میں قصے اور واقعات بیان کرنے کا مقصد تاریخی معلومات کی فراہمی بذاتِ خود نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن کسی واقعے کے وہی پہلو بیان کرتا ہے جو ہدایت و عبرت کے لیے ضروری ہوں؛ نام، تاریخ اور جزئی تفصیلات جو مقصد سے غیر متعلق ہوں انہیں عموماً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعہ مختلف مقامات پر

مختلف پہلوؤں کے ساتھ آتا ہے۔ طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ ایام اللہ کے واقعات کو اسی قرآنی مقصد کے تحت پڑھے، یعنی اول عبرت، دوم الٰہی سنت کی پہچان اور سوم اپنے عمل کی اصلاح۔

نتیجہ

خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عنوان تذکیر بایام اللہ علومِ خمسۂ قرآن میں سے وہ علم ہے جو اللہ کے ان یادگار دنوں اور تاریخی واقعات کے بیان سے متعلق ہے جن میں اس کی نصرت، نعمت یا عذاب کا ظہور ہوا۔ سورۂ ابراہیم کی آیت اس کی بنیاد ہے، بنی اسرائیل کی نجات، سابقہ قوموں کی ہلاکت، یوم الفرقان اور فتحِ مکہ اس کے روشن نمونے ہیں، اور اس کے مقاصد عبرت، تثبیتِ قلب، الٰہی سنت کی پہچان اور صبر و شکر کی تربیت ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ علم ماضی کو حال کی ہدایت کا ذریعہ بناتا ہے اور انسان کو بتاتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اللہ کے مقرر کردہ قانون کے تابع ہے۔

سوال نمبر :4 قرآنِ مجید کے اعجاز کی وجوہات اور تفسیر کے سات رجحانات 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ قرآن مجید کے اعجاز کی کون کون سی وجوہات ہیں؟ نیز تفسیر کے سات رجحانات کی وضاحت کیجئے۔(20)

تعارف

قرآنِ مجید کا معجزہ ہونا اس کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔" اعجاز "سے مراد ہے عاجز کر دینا، یعنی قرآن نے اپنے مخالفین کو چیلنج کیا کہ اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور چودہ سو سال سے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء اس چیلنج کے سامنے عاجز ہیں۔ دوسری طرف قرآن کی یہی کتاب جب پڑھی اور سمجھی جانے لگی تو اس کی تفسیر کا ایک عظیم سلسلہ شروع ہوا، جس میں ہر دور کے علماء نے اپنے ذوق اور اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق مختلف رجحانات اختیار کیے۔ اس سوال کے پہلے حصے میں اعجازِ قرآن کی وجوہات بیان کی جائیں گی اور دوسرے حصے میں تفسیر کے سات مشہور رجحانات کی وضاحت کی جائے گی۔

اعجازِ قرآن کی وجوہات

علماء نے اعجازِ قرآن کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں جن میں سے اہم درج ذیل ہیں۔ پہلی وجہ فصاحت و بلاغت ہے۔ قرآن عربی زبان کے اس اعلیٰ ترین معیار پر ہے جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملی اور نہ بعد میں۔ اس کی نظم، الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ترکیب، اختصار میں جامعیت اور ایجاز میں وسعت ایسی ہے کہ اس دور کے بڑے شاعر و خطیب بھی اس کے سامنے سرنگوں ہوئے، اور ولید بن مغیرہ جیسے دشمن نے بھی اعتراف کیا کہ اس کلام میں ایک خاص حلاوت اور نور ہے اور یہ انسان کا کلام نہیں لگتا۔ دوسری وجہ خود تحدی ہے :قرآن نے مرحلہ وار چیلنج دیا کہ پورا قرآن بنا لاؤ)الاسراء(88 :، پھر دس سورتیں) ہود(13 :، پھر ایک سورت) البقرہ23 :، یونس(38 :، اور وعدہ کیا کہ اگر ساری انسانیت اور جنات جمع ہو جائیں تب بھی اس جیسی کتاب نہ لا سکیں گے۔ چودہ صدیوں سے یہ چیلنج قائم ہے اور یہی اس کے اعجاز کی کھلی دلیل ہے۔

تیسری وجہ غیب کی خبریں ہیں۔ قرآن نے ماضی کے وہ واقعات بیان کیے جو ایک اُمّی نبی ﷺ کے لیے بذریعۂ وحی کے بغیر جاننا ممکن نہ تھا، جیسے انبیاء کے قصص کی ایسی تفصیلات جو اہلِ کتاب کے پاس بھی مکمل محفوظ نہ تھیں؛ اور مستقبل کی پیش گوئیاں بھی دیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں، مثلاً رومیوں کی شکست کے بعد چند سالوں میں ان کی فتح کی خبر) الروم (4-2 :اور ابو لہب کے ایمان نہ لانے کی پیش گوئی جو اس کی زندگی میں سچ ثابت ہوئی۔ چوتھی وجہ قرآن کا داخلی نظم و ربط اور اختلاف سے پاک ہونا ہے :تیئیس سال میں مختلف حالات میں نازل ہونے کے باوجود اس میں نہ تعارض ہے نہ تضاد، اور خود قرآن نے فرمایا کہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے) النساء(82 :۔

پانچویں وجہ اس کا تشریعی و تہذیبی کمال ہے۔ قرآن نے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، معیشت اور سیاست کے ایسے متوازن اصول دیے جو ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کرتے رہے اور جن میں نہ یہودیت جیسی سختی رہی نہ رہبانیت جیسی دنیا سے کٹ جانے والی نرمی، بلکہ اعتدال والی امتِ وسط کا راستہ دیا گیا۔ چھٹی وجہ اس کے علمی و کائناتی اشارات ہیں جن کی صداقت بعد کے زمانوں میں کھلتی رہی اور جنہوں نے بہت سے اہلِ علم کو قرآن کی حقانیت کا قائل کیا۔ ساتویں وجہ اس کی تاثیر و ہدایت ہے :پتھر دل اسے سن کر نرم ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے

سخت مزاج انسان سورۂ طٰہٰ سن کر بدل گئے، اور آج بھی کروڑوں انسان اس کی تلاوت سے سکون پاتے ہیں۔ آٹھویں وجہ اس کی حیرت انگیز حفاظت و اشاعت ہے کہ یہ واحد کتاب ہے جسے لاکھوں انسانوں نے لفظ بہ لفظ یاد کیا اور دنیا کے ہر خطے میں اس کے نسخے ایک جیسے پائے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تمام وجوہات مل کر ثابت کرتی ہیں کہ قرآن انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔

تفسیر کے سات رجحانات

تفسیر کے رجحان سے مراد مفسر کا وہ غالب زاویۂ نظر اور اسلوب ہے جس کے تحت وہ قرآن کی تشریح کرتا ہے۔ تاریخِ تفسیر میں سات بڑے رجحانات نمایاں ہیں۔

1۔ تفسیر بالماثور یا روایتی رجحان

اس رجحان میں قرآن کی تفسیر قرآن، احادیثِ نبوی، اقوالِ صحابہ اور تابعین کی منقول روایات سے کی جاتی ہے۔ یہ سب سے قدیم اور معتبر رجحان ہے، کیونکہ اس میں ذاتی رائے کے بجائے منقول علم پر اعتماد ہوتا ہے۔ جامع البیان از امام طبری، تفسیر القرآن العظیم از حافظ ابن کثیر اور الدر المنثور از امام سیوطی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

2۔ فقہی و احکامی رجحان

اس رجحان میں آیاتِ احکام سے فقہی مسائل کے استنباط پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے، مختلف فقہی مذاہب کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور مسائل میں ترجیح قائم کی جاتی ہے۔ احکام القرآن از امام جصاص، احکام القرآن از ابن العربی اور الجامع لاحکام القرآن از امام قرطبی اس رجحان کی شاہکار کتب ہیں۔

3۔ کلامی و اعتقادی رجحان

اس رجحان میں عقائد کی تشریح، فرقِ باطلہ کا رد اور عقلی دلائل سے مذہبی مسائل کا اثبات مرکز ہوتا ہے۔ مفسر اپنے کلامی مسلک کے اصولوں کی روشنی میں آیات کی تاویل و تشریح کرتا ہے۔ مفاتیح الغیب یعنی تفسیر کبیر از امام فخر الدین رازی اس کی سب سے بڑی مثال ہے، جبکہ زمخشری کی الکشاف میں معتزلی کلامی رجحان بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

4۔ لغوی، ادبی و بلاغی رجحان

اس رجحان میں زبان و ادب کے رخ سے قرآن کو سمجھا جاتا ہے :الفاظ کی لغوی تحقیق، نحو و صرف کے مسائل، صرفی و بلاغی نکات اور اعجازِ بیانی کی وضاحت اس کا خاص موضوع ہے۔ الکشاف از زمخشری، البحر المحیط از ابو حیان اندلسی اور روح المعانی از علامہ آلوسی میں یہ رجحان بہت نمایاں ہے۔ اردو میں بھی کئی تفاسیر اس ادبی ذوق کو لیے ہوئے ہیں۔

5۔ صوفیانہ و اشاری رجحان

اس رجحان میں آیات کے ظاہری معنی کے ساتھ ان کے باطنی اشارات، روحانی کیفیات اور سلوک و تزکیے کے نکات بیان کیے جاتے ہیں۔ حقائق التفسیر از سلمی، عرائس البیان از روزبہان بقلی اور ابن عربی سے منسوب تفسیری اشارات اس کی مثالیں ہیں۔ اس رجحان کی شرط اہلِ علم نے یہ رکھی ہے کہ اشاری معنی ظاہری مفہوم کے منافی نہ ہو، ورنہ وہ تفسیر نہیں بلکہ تحریف بن جاتا ہے۔

6۔ علمی و سائنسی رجحان

اس رجحان میں آیاتِ کائنات کو جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ نئے تعلیم یافتہ ذہن کے سامنے قرآن کی حقانیت واضح ہو۔ طنطاوی جوہری کی الجواہر فی تفسیر القرآن اس رجحان کی مشہور کتاب ہے۔ اس رجحان میں احتیاط ضروری ہے کہ سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں، اس لیے انہیں قرآن کا قطعی مفہوم قرار نہیں دینا چاہیے۔

7۔ موضوعی، عصری و معاشرتی رجحان

جدید دور میں یہ رجحان سب سے زیادہ فروغ پا گیا ہے۔ اس میں قرآن کی ہدایت کو موجودہ دور کے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور تفسیر موضوعی یعنی مضمون وار مطالعے کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ فی ظلال القرآن از سید قطب، تفہیم القرآن از سید ابو الاعلیٰ مودودی اور تدبرِ قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی اس عصری و ہدایتی رجحان کی نمایاں نمائندہ کتب ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز اس کی فصاحت و بلاغت، تحدی، غیبی خبروں، داخلی نظم، تشریعی کمال، علمی اشارات، تاثیر و ہدایت اور بے مثال حفاظت پر قائم ہے، اور یہ وجوہات کسی انسانی کلام میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسری جانب تفسیر کے سات رجحانات — روایتی، فقہی، کلامی، ادبی و بلاغی، صوفیانہ اشاری، علمی سائنسی اور عصری معاشرتی — اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآن کا فہم ہر دور میں زندہ و متحرک رہا ہے۔ طالب علم کے لیے بہتر روش یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ماثور تفسیر کو بنیاد بنائے اور پھر دوسرے رجحانات سے مستفیض ہو، تاکہ اس کا فہم متوازن اور مستند رہے۔

سوال نمبر :5 تفسیر بالماثور، اس کے ذیلی طرق اور عہد رسالت میں تفسیر کا اسلوب نمبر(20)

سوال نمبر5 ۔ تفسیر بالماثور سے کیا مراد ہے؟ تفسیر بالماثور کے ذیلی طرق بیان کرتے ہوئے عہد رسالت میں تفسیر قرآن کے اسلوب کی وضاحت کیجئے۔(20)

تعارف

تفسیر کا سب سے قدیم، سب سے محفوظ اور سب سے معتبر ذریعہ تفسیر بالماثور ہے۔ ہر دور کے محققین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کی بنیاد وہ تشریح ہے جو خود صاحبِ قرآنﷺ ، ان کے تربیت یافتہ صحابہ اور ان سے علم حاصل کرنے والے تابعین سے منقول ہو۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے مشہور" مقدمہ فی اصول التفسیر "میں تفسیر کے مراتب اسی ماثور بنیاد پر قائم کیے ہیں۔ اس سوال میں پہلے تفسیر بالماثور کا مفہوم بیان کیا جائے گا، پھر اس کے ذیلی طرق کی تفصیل آئے گی اور آخر میں عہدِ رسالت میں تفسیرِ قرآن کے اسلوب کی وضاحت کی جائے گی۔

تفسیر بالماثور کا مفہوم

"ماثور "عربی لفظ" اثر "سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نقل شدہ روایت، پچھلوں سے پہنچا ہوا علم اور وہ بات جو سند کے ساتھ منقول ہو۔ اصطلاح میں تفسیر بالماثور سے مراد قرآنِ مجید کی وہ تشریح ہے جو قرآنِ مجید ہی سے، یا رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے، یا صحابہ کرام کے اقوال سے، یا تابعین کے اقوال سے نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہو۔ اس کے مقابلے میں تفسیر بالرائے وہ ہے جس میں مفسر اپنے اجتہاد، علمِ لغت اور عقلی غور سے مفہوم متعین کرتا ہے۔ تفسیر بالماثور کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں مفسر کا ذاتی گمان شامل نہیں ہوتا بلکہ اس زمانے کی گواہی شامل ہوتی ہے جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، عربی زبان فطری طور پر بولی جاتی تھی اور اسبابِ نزول آنکھوں دیکھے واقعات تھے۔ اسی لیے اس تفسیر کو" تفسیر منقول "بھی کہا جاتا ہے۔

تفسیر بالماثور کے ذیلی طرق

تفسیر بالماثور کے چار ذیلی طرق ہیں جو اعتبار و ترجیح کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آتے ہیں۔

1۔ تفسیر القرآن بالقرآن

یہ سب سے اعلیٰ اور مستند طریق ہے، کیونکہ قرآن کی ایک آیت کی وضاحت خود قرآن کی دوسری آیت سے ہو تو اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی۔ قرآن میں بعض احکام ایک جگہ مجمل آتے ہیں اور دوسری جگہ ان کی تفصیل مل جاتی ہے؛ بعض مطلق باتوں کی قید دوسری آیت میں ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ فاتحہ میں" صراط الذین انعمت علیہم "کی وضاحت سورۂ نساء کی آیت سے ہوتی ہے کہ اللہ کے انعام یافتہ لوگ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں) النساء : 69)۔ اسی طرح اہلِ جنت سے کیے گئے وعدے اور احکام کی اجمالی آیات کی تفاصیل دیگر مقامات پر موجود ہیں۔ مفسر سب سے پہلے اسی طریق سے کام لیتا ہے۔

2۔ تفسیر القرآن بالسنت

دوسرا طریق تفسیر بالحدیث ہے، یعنی قرآن کی تشریح رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و اعمال سے کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپ ﷺ کو یہ منصب عطا فرمایا" :وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ "یعنی ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر نازل کیا

تاکہ آپ لوگوں کے لیے وہ کچھ کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے) النحل(44 :۔ نماز کی رکعتوں، زکاۃ کے نصاب اور حج کے مناسک جیسے بڑے احکام کی عملی تفصیل قرآن میں اجمالاً ہے اور اس کی پوری صورت سنت سے ملتی ہے۔ اسی لیے تفسیر بالماثور میں احادیث کا مطالعہ ناگزیر ہے، اور ابن کثیر و طبری نے اس طریق کو بھرپور استعمال کیا ہے۔

3۔ تفسیر باقوال الصحابہ

تیسرا طریق صحابہ کرام کے اقوال سے تفسیر کرنا ہے۔ صحابہ نے قرآن براہِ راست نبی کریم ﷺ سے سیکھا، وہ اسبابِ نزول کے شاہد تھے اور عربی زبان کے فطری اہل تھے، اس لیے خصوصاً اسبابِ نزول اور واقعات سے متعلق ان کا قول حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحابہ میں تفسیر کے مشہور شخصیات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں جنہیں" ترجمان القرآن "کہا جاتا ہے اور جن کے لیے نبی کریم ﷺ نے دعا کی تھی کہ اے اللہ انہیں دین کی سمجھ اور تاویل کی تعلیم عطا فرما۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے تفسیری اقوال کثرت سے منقول ہیں۔

4۔ تفسیر باقوال التابعین

چوتھا طریق تابعین کے اقوال ہیں۔ تابعین وہ بزرگ ہیں جنہوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا، جیسے مدینہ میں سعید بن مسیب، مکہ میں مجاہد بن جبر اور عکرمہ، بصرہ میں حسن بصری اور قتادہ، اور کوفہ میں علقمہ و مسروق رحمہم اللہ۔ انہوں نے صحابہ کے فیض کو آگے منتقل کیا۔ ان کے اقوال کا درجہ صحابہ کے بعد آتا ہے اور جہاں ان میں اختلاف ہو وہاں اصولِ ترجیح سے کام لیا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ کے مطابق تابعین کے اقوال بذاتِ خود حجت نہیں، لیکن وہ ماثور فہم کی اہم کڑی ہیں اور اگر کسی مفہوم پر ان کا اتفاق ہو تو وہ بہت وزنی ہوتا ہے۔

عہدِ رسالت میں تفسیرِ قرآن کا اسلوب

عہدِ رسالت میں تفسیر کا مرکز و محور خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ اس اسلوب کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ تفسیر ضرورت کے بقدر ہوتی تھی؛ کیونکہ صحابہ خود عرب تھے، زبان ان کے لیے اجنبی نہ تھی، انہیں عموماً الفاظ کے

معنی میں دشواری نہ ہوتی، البتہ جہاں کوئی مجمل حکم، مشکل مفہوم یا عملی صورت پیش آتی، نبی کریم ﷺ اسے واضح فرما دیتے۔ اسی لیے اس دور کی تفسیر آج کی ضخیم تفاسیر کی شکل میں نہیں، بلکہ ہدایت و عمل کی عملی تشریح کی صورت میں ملتی ہے۔

دوسری خصوصیت مجمل کی تفصیل اور مطلق کی تقیید تھی۔ مثال کے طور پر ظلم کی آیت پر صحابہ پریشان ہوئے کہ ہم میں سے کون ہے جو اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کرتا، تو آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے، جیسا کہ لقمان کی نصیحت میں ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے) الانعام82 :، لقمان(13 :۔ اسی طرح حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سفید و سیاہ دھاگے کو تکیے کے نیچے رکھ کر روزے کی حد سمجھنے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے سمجھایا کہ اس سے مراد رات کی تاریکی اور دن کی سفیدی ہے) البقرہ(187 :۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ماثور تفسیر کی بنیاد خود عہدِ رسالت میں ہی پڑ چکی تھی۔

اس اسلوب کی تیسری خصوصیت عملی تفسیر تھی۔ نبی کریم ﷺ کا عمل قرآن کی زندہ تشریح تھا، اسی لیے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق پوچھنے پر فرمایا تھا" :کان خلقه القرآن" یعنی آپ کا اخلاق قرآن ہی تھا۔ نماز، روزہ، حج، جہاد، معاملات اور معاشرت میں آپ ﷺ کا عمل صحابہ کے سامنے آیات کی عملی صورت پیش کرتا تھا۔ چوتھی خصوصیت سوالات کے جوابات کی شکل تھی :صحابہ کرام مجالس میں سوالات کرتے اور آپ ﷺ وحی یا اپنے ارشاد سے جواب دیتے۔ بعض مواقع پر سوال کے جواب میں باقاعدہ آیت نازل ہوتی، جس سے اسبابِ نزول کا علم وجود میں آیا۔ پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں تفسیر کے نام پر ذاتی رائے کا کوئی دخل نہ تھا؛ جو سمجھ نہ آتا اس پر توقف کیا جاتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب" ابّاً) "عبس (31 :کے معنی پوچھے گئے تو انہوں نے اللہ کی کتاب کے بارے میں بے علمی کی بات کہنے سے شدت سے پرہیز فرمایا، یہی احتیاط ماثور تفسیر کی روح ہے۔

عہدِ رسالت کے بعد صحابہ نے اسی اسلوب کو آگے بڑھایا اور مکہ، مدینہ، کوفہ اور بصرہ میں تفسیر کے حلقے قائم ہوئے، جن سے تابعین نے فیض پایا۔ اس طرح ماثور تفسیر کی زنجیر سند در سند چلتی ہوئی مدون تفاسیر تک پہنچی۔ اس سلسلے میں ایک احتیاط کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ماثور روایات کے ساتھ بعد کے زمانوں میں اسرائیلی روایات بھی شامل ہوتی رہیں، اس لیے محدثین و مفسرین نے سند کی جانچ اور درایت کے اصولوں سے کام لے کر صحیح و ضعیف میں امتیاز قائم رکھا۔ یہی جانچ پڑتال اس علم کی امانت داری کی دلیل ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر بالماثور سے مراد قرآن کریم کی وہ تشریح ہے جو قرآن، سنت، اقوالِ صحابہ اور اقوالِ تابعین کی منقول روایات پر مبنی ہو۔ اس کے چار ذیلی طرق درجہ وار یہ ہیں :تفسیر القرآن بالقرآن، تفسیر بالسنت، تفسیر باقوال الصحابہ اور تفسیر باقوال التابعین۔ عہدِ رسالت میں اس کی بنیاد خود نبی کریم ﷺ نے رکھی، جن کا اسلوب ضرورت کے بقدر بیان، مجمل کی تفصیل، آیات کی عملی تشریح اور صحابہ کے سوالات کے جوابات پر مشتمل تھا، اور اس میں ذاتی رائے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آج بھی مستند فہمِ قرآن کے لیے اسی ماثور بنیاد کو اصل ماننا ضروری ہے۔

USMAN NOTES www.usmannotes.com